کئی چاند تھے سرِ آسماں: زبان و بیان

محمد شہباز

لیکچرار اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور

STYLE AND DICTION OF KAI CHAND THEY SAR-E-AASMAN

Muhammad Shahbaz

Lecturer in Urdu

Government Islamia College, Civil Lines, Lahore

Abstract

Shams-ur-Rahman Farooqi is a great Urdu novelist of modern age. For any novel to be successful it needs pinnacle of expression and engaging language. If entrances of language and that too such a sweet and vigorous one as Urdu, are not taken into account, the novel fails to find recognition. Taken in this context, KAI CHAND THEY SAR-E-AASMAN should be ranked as a masterpiece. The article is an effort to study the said novel's diction and style.

Keywords:

شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسمان، ڈاکٹر سہیل بخاری، سید مظہر جمیل،

اردو محاورہ، اردو ناول

کسی بھی ناول کی کامیابی کا سہرا بہ ہرصورت انشا پردازی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔دراصل واقعات کی مدد سے ناول نگار خارجی دنیا سے جواثر قبول کرتا ہے، وہ اُسے انشا پردازی کے ذریعے ہی قارئین تک پہنچاتا ہے۔زبان وبیان کی موشگافیوں اور لطافتوں کا لحاظ اگر کسی ناول کی تخلیق میں نہ رکھا گیا ہوتو وہ ناول سندِاعتبار حاصل کرنے میں صریحاً ناکام رہتا ہے۔بہ قول ڈاکٹر سہیل بخاری:

> ''ناول نگار واقعات سے جواثر قبول کرتا ہے وہ لفظوں اور جملوں کے ذریعے ہی دوسروں تک پہنچاتا ہے۔اس لیے اثر پذیری کی صحیح صحیح ترجمانی اور واقعی عکاسی اس کے اسلوب بیان کی دلکشی ودلآویزی پر ہی منحصر ہے۔''(۱)

درحقیقت ناول میں ہر واقعہ کو ایک خاص پیرایۂ بیان سے پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر بالفرض یہ پیرایۂ بیان پُرتاثیر نہ ہوتو ناول مجموعی تأثر کا وصف کھودیتا ہے،اِس لیے ایک عمدہ ناول میں قاری کی جمالیاتی حسیات کو متحرک کرنے کے ساتھ ساتھ،موزوں الفاظ وتراکیب اور چُست فقروں کی بھی از حد ضرورت ہوتی ہے،گویا زبان وبیان میں جس قدر حسن و لطافت ہوگی،اُسی درجہ قاری پر اُن واقعات کی اثر پذیری کا نفاذ عمل میں آئے گا۔مختصر یہ کہ فنِ ناول نگاری میں اظہارِ بیان کی خوبی کسی بھی ناول کو بامِ عروج پر پہنچادیتی ہے۔

اِس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے،جس میں فاروقی نے ایک غائب اور خودساختہ کردار کی یادداشتوں کا سہارا لے کر اِس ناول کی بُنت کی ہے،تاہم اُن کا انداز بیاں اِس قدر رجحان دار اور پُراثر ہے کہ ناول کا بیشتر حصہ تہذیبی وتاریخی ہونے کے باوجود بناوٹی یا پُرتصنع محسوس نہیں ہوتا اور اِس میں سارا کمال اُن کے شگفتہ اور دل فریب اسلوب کا ہے۔مصنف نے اِس ضمن میں یہ کوشش التزاماً روا رکھی ہے کہ زبان کا استعمال مذکورہ دور کی زبان کے عین مطابق کیا جائے،تاکہ اُس تہذیب کو اُس کے اصل رنگ میں بازیافت کیا جاسکے۔اُنھوں نے زبان کا استعمال کرتے ہوئے اِس بات کا بھی خصوصی خیال رکھا ہے کہ الفاظ وتراکیب،جملوں کی ساخت،روزمرہ ومحاورہ اور طرزِ گفتگو اُس دور کی زبان سے میل کھاتی ہو۔یوں برملا کہا جاسکتا ہے کہ فاروقی نے اِس ناول میں اُس دور کی زبان،لب ولہجہ اور طرزِ تخاطب کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔(۲)مختصر یہ کہ اِس ناول میں الفاظ کا انتخاب اِس قدر اعلیٰ اور مناسب ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماحول اور ناول کے پلاٹ کے اشارے پر ہی اُن کی تخلیق ہوئی ہے۔(۳)اِس حوالے سے رخسانہ بی بی رقم طراز ہیں:

> ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی زبان بھی تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے اور اس میں تمام

الفاظ اس عہد اور جگہ کی مناسبت سے استعمال کیے گئے ہیں۔یقیناً یہ ایک مشکل اور اہم کام ہے جو ناول نگار نے کیا ہے۔'' (۴)

اِس ناول کی مجموعی فضا ادبی وتہذیبی مزاج کی حامل ہے،تاہم اِس میں خشک فلسفہ آرائی اور بے رنگ عقلیت کا شائبہ تک موجود نہیں۔شروع سے آخر تک تہذیبی وتاریخی رنگ پورے ناول میں پس منظر کے طور پر جھلکتا رہتا ہے۔اِس تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے فاروقی نے روزمرہ ومحاورہ،ہند اسلامی تہذیب اور دہلوی اندازِ گفتگو سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔زبانِ دہلوی،شستہ ورنگین عبارتیں اور اِس پر روزمرہ ومحاورہ کا برمحل استعمال دراصل یہی اجزا مل کر اِس ناول کی زبان کو تخلیق کرتے ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اِس ناول میں یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ وہ ''دلی کے روڑے'' ہیں،مگر زبان اُنھوں نے ایسی لکھی ہے،جسے کوئی دلی کا روڑا ہی لکھ سکتا ہے۔فی الحقیقت اِس ناول کی اصل خوبی اور قوت اِس کی زبان وبیان میں ہی پوشیدہ ہے۔(۵)

ہند اسلامی تہذیب کے تناظر میں دہلی ہندوستان کا دل،تہذیبی وثقافتی تنوع کے اعتبار سے ہندوستان کا منبع وسرچشمہ اور تاریخی وادبی کردار کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔اِس شہر کی تہذیب وثقافت کی افزائش اور نشوونما میں اُردو زبان نے ایک ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے اور دورِ حاضر میں بھی یہ زبان دلی کی تہذیبی وادبی آبیاری کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہے۔مختصر یہ کہ اِس شہر کی تہذیب پورے برصغیر کی مختلف النوع تہذیبوں کا عطر ہے۔اِس لیے اِسے ہند اسلامی تہذیب کا مرکز قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔کہا جاتا ہے کہ غدر سے پہلے بادشاہ کے حضور میں پرچہ گذرا کہ آج شہر والوں نے کھٹ مُوں کو خوب پیٹا۔کھٹ مُوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ شہر میں پھیری پھرنے آتے تو آواز لگاتے:''کھاٹ بنالو،کھاٹ بنالو۔''شہر والوں نے کہا:نکلے تمہاری کھاٹ،یہ کیا بُری فال منھ سے نکالتے ہو۔پھر جو اُنھیں پیٹا تو پیٹتے پیٹتے جھلنگا نکال دیا اور اس ٹکسال باہر لفظ سے توبہ کرائی اور اُنھیں سمجھایا کہ بجائے کھاٹ مُوالو کے چارپائی بُنالو کہا کرو۔ذرا غور کیجیے جہاں اِس تکلف اور تدبر سے زبان کو سنوارا گیا ہو وہاں کے زبان دان کیوں نہ اپنی زبان پر ناز کریں۔(۶)

قابلِ غور امر یہ ہے کہ اِس ناول کی زبان آج کے زمانے کی نہیں،بل کہ اُسی دور کی ہے،جس زمانے کے یہ واقعات ہیں۔مزید یہ کہ اِس ناول کی زبان 'زمان' کے ساتھ چلتی ہے،جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے،کچھ پرانے الفاظ متروک ہوتے جاتے ہیں اور نئے الفاظ ناول کی کہانی میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔یہ تبدیلی اچانک نہیں ہوتی،اِس لیے اِس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ناول کی زبان کب تبدیل ہوگئی۔یہی نہیں بل کہ 'مکان' کی تبدیلی سے اُس نئی جگہ اور اس نئے زمانے کے الفاظ وتراکیب کو مصنف نے گہری تحقیق کے بعد ہی استعمال کیا ہے۔(۷)یعنی اِس ناول میں زبان وبیان اور بیانیہ گفتگو میں صرف متعلقہ عہد کے الفاظ

استعمال کیے گئے ہیں اور ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا، جو اُس عہد میں مستعمل نہ تھا۔(۸) ذرا دیکھیے:

''اب لٹھیت بھی کچھ نرم پڑا۔ راستہ کیوں نہیں دیاں گے۔ پر صاب جاں گے کہاں یہ تو پتہ چلے۔ اگے تو رستہ بند ہے۔''(۹)

اِس ناول کے نمائندہ کرداروں کے ہاں بالعموم مہذب اور شریفانہ گفتگو کا چلن ملتا ہے، جس میں رکھ رکھاؤ، حفظِ مراتب، موقع شناسی، نقطہ آفرینی اور رمز و اشارہ کے خصائص خوب مزا کرتے ہیں۔ ایک کامیاب ناول نگار کا یہ نمایاں وصف ہوتا ہے کہ وہ کرداروں کے حسبِ حال زبان استعمال کرتا ہے۔ فاروقی کا کمال یہ ہے کہ اِس ناول میں کرداروں کا ایک جنگل ہونے کے باوجود ہر کردار کی زبان اُس کی سماجی حیثیت کی مناسبت سے بدلتی رہتی ہے، جس کی وجہ سے ناول میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہمہ وقت موجود رہتا ہے:

''میاں میری مانو تو اپنے بادشاہ کو واپس قلعے میں لے چلو یہاں کا مورچہ مخدوش ہو رہا ہے۔''(۱۰)

''ارے اب تو جاوتی کیوں نیں بلاول پاس۔ ابھی تک تو ٹھنک رہی تھی کہ بلاول آئے کیوں نہیں کہاں رہ گئے۔''(۱۱)

درحقیقت زبان طاقت کے تعلقات کو منعکس کرتی ہے اور اِس بات کا احساس ہمیں اُس وقت شدت سے ہوتا ہے، جب ہم وزیر بیگم کو مردوں کے ساتھ ہم کلام ہوتا دیکھتے ہیں۔(۱۲) شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے نسوانی کرداروں کے لیے جو زبان استعمال کی ہے، وہ اِس قدر شیریں اور دل کش ہے کہ قاری مصنف کو بے ساختہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور اِس پر مستزاد یہ کہ عورتوں کی زبان بالخصوص دہلی کی بیگماتی زبان لکھنے میں اُن کے قلم نے جو بہاریں دکھائی ہیں، وہ انتہائی پُر لطف اور سحر طراز ہیں۔ اِس ناول میں اُن کے ہاں نسائی لب ولہجہ اور زبان کا مشاہدہ عمیق ترین سطح پر دکھائی دیتا ہے۔ بہ اعتبار زبان اِس ناول کے نسوانی کردار مرد کرداروں کی بہ نسبت زیادہ مؤثر اور مضبوط دکھائی دیتے ہیں:

''اور اگر وہ خفا ہو گئے تو؟ ہو جائیں خفا میری بلا سے۔ ایسوں کو تو میں اپنی پیزار پر رکھوں ہوں، وہ میرا کیا کر لیں گے۔ نواب صاحب خفا ہوں گے تو انھیں منا لوں گی۔ نہیں تو منجھلی باجی کے ہاتھ میں تو وہ بالکل موم ہیں، ان سے کہہ دوں گی۔ مجھے کسی موئے مشٹنڈے انگریز کے حرم میں پڑے سڑتے رہنا منظور نہیں بلا سے وہ فارسی ہی بولتا ہو۔۔۔ وہ انکھ مندی اور ہوں گی جو دو وقت کی روٹی پر آبرو بیچ دیتی ہیں۔''(۱۳)

زبان کے فنی اوصاف کی بات کی جائے تو تشبیہ و استعارہ کا استعمال تو اِس ناول میں حد سے سوا کیا

گیا ہے، مگر اس باب میں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ تشبیہات نہ صرف آسان فہم اور موقع و محل کے مطابق استعمال کی گئی ہیں، بل کہ اپنے استعمال کا منطقی جواز بھی مہیا کرتی ہیں۔ عام طور پر صنفِ ناول میں تشبیہات کا خوب صورت استعمال کم کم دیکھنے میں آتا ہے، لیکن ''کئی چاند تھے سر آسماں'' میں تشبیہات کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔(۱۴) ذرا دیکھیے:

''بھلی کے تین پر دے جھرانا مار کر یوں اڑے گویا لومڑی کے خوف سے بوکھلائے ہوئے تیتر ہوں۔''(۱۵)

''اس کی آنکھ مخصوص اللہ پر یوں تھی جیسے کسی کے سینے پر خنجر کی انی رکھ دی جاتی ہے۔''(۱۶)

''اس کے حمایتی جاڑوں کی دھوپ کی طرح ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔''(۱۷)

''ہر طرف ایک ماتم کی سی گونج اٹھی جو ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح تیزی سے سارے شہر میں پھیل گئی۔''(۱۸)

جہاں تک استعارات کا تعلق ہے تو شمس الرحمٰن فاروقی کی زبان میں بھونڈے، بدصورت، غیر ضروری اور رواجِ عام سے ہٹے ہوئے استعارے نہیں پائے جاتے، بل کہ اس کے برعکس انھوں نے اِس ناول میں فہیم العقل، حسبِ حال اور جدت طراز استعارات استعمال کیے ہیں۔ ثبوت کے طور پر استعارہ کی یہ مثال دیکھیے:

''یعقوب اور داؤد نے دل میں سوچا کہ اب اور تھوڑی بھی دیر کی گئی تو اندھیرا ہر طرف چھا جائے گا اور یہ دونوں جل پریاں نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی۔''(۱۹)

اِس ناول میں شمس الرحمٰن فاروقی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ دراصل اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی دہلوی تہذیب کی حامل وہ زبان ہے، جس میں روزمرہ و محاورہ کی چاشنی اپنے پورے جوبن پر دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص محاورات و ضرب الامثال کا استعمال اِس ہند اسلامی تہذیب کا خاصہ تھا، جس کے بولنے والے محاورات کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ فاروقی نے اِس ناول میں ایسے ایسے محاورات استعمال کیے ہیں کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی پوری ہند اسلامی تہذیب زندہ ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ محاورات کا استعمال فی الاصل کفایتِ لفظی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ محاورے کے استعمال میں اِس بات پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے کہ سماجی و تہذیبی زندگی کا رنگ بھی اِن میں جھلکتا ہوا محسوس ہو۔ محاورے کا بامحل استعمال، محاورات کی بھرمار یا اسرافِ الفاظ کا نام نہیں، بل کہ یہ تو لفظی کفایت شعاری کا ایک خوش نما عمل ہے، گویا تھوڑے لفظوں میں اجتماعی یا انفرادی زندگی کا کوئی مرقع اگر پیش کرنا ہو تو اِس کے لیے

اچھے اور برمحل محاورے سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں، قصہ کوتاہ مناسب اور برمحل محاورہ بندی ایک بے ساختہ تہذیبی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمدہ اور زندہ نثر میں محاورہ بلایا نہیں جاتا خود بخود آجاتا ہے۔ (۲۰) ذرا دیکھیے:

''سیدھے سبھاؤ بات کرو چھوٹی۔ یہ دلی نہیں ہے، رام پور ہے۔ گھڑی بھر میں سارے بل نکلوا دیئے جائیں گے۔''

''میرا بل میرا اللہ ہے اور میرے نواب ہیں۔''

تمھارے نواب کہاں سے ہوگئے بیگما۔ تم غیر ذات غیر مذہب غیر گھر کی لگائی جس نے چار پیسے دکھائے اسی کی ہو رہیں۔''

''پھوپھی صاحب۔ آپ کی گالیوں کا گالا بنا کر ہوا میں اڑادوں گی، لام کاف بکنے سے بچہ آپ کا نہ ہو جائے گا۔'' (۲۱)

اِس ناول میں پیش کی گئی تہذیب اپنے محاورات کی شکل میں اپنا تعارف خود کرواتی ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی محاورات کے استعمال میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے، تاہم سید مظہر جمیل کی رائے ہے کہ:

''بے شمار الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال ہیں جو زمانے کی گرد فراموش گاری میں دفن ہو چکے تھے، جن کی بازیافت کی گئی ہے۔'' (۲۲)

سید مظہر جمیل کا مذکورہ بیان کسی حد تک صداقت کے جوہر سے عاری معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اِس ناول میں آنے والے محاورات بہت عام فہم اور ہماری روزمرہ کی بول چال کا ناگزیر حصہ ہیں اور اِن کا تعلق زمانے کی گرد میں مدفون کسی فراموش کنندہ دنیا سے نہیں۔ اِس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں:

دل ایک بانس اچھلا (ص ۴۷) الٹی گنگا بہانا (ص ۱۴۲) کلیجہ پانی ہو جانا (ص ۱۶۴) طرح دینا (ص ۲۰۱) نیت شب حرام (ص ۲۷۸) دل بلیوں اچھلنا (ص ۲۸۶) بیل منڈھے چڑھنا (ص ۳۳۹) ناک چوٹی رہ جانا (ص ۳۵۰) جز بز ہونا (ص ۳۶۳) ٹکا سا جواب دینا (ص ۳۷۲) ہکا بکا رہ گیا (ص ۳۷۶) خدا لگتی کہنا (ص ۳۸۰) بے نیل مرام (ص ۴۰۹) کاٹو تو بدن میں لہو نہیں (ص ۴۱۱) حیض بیض میں پڑنا (ص ۵۰۵) ہوا باندھنا (ص ۵۱۳) کلیجہ منھ کو آنا (ص ۵۲۲) غم غلط کرنا (ص ۵۴۸) کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا (ص ۵۵۹) دم سادھ لینا (ص ۵۷۲) فیل مچانا (ص ۶۰۸) چھاتی پر مونگ دلنا (ص ۶۲۴) کس بر تے پر تتا پانی (ص ۶۴۵) بغلیں بجانا (ص ۶۶۹) گاڑھی چھننا (ص ۶۹۴) ہری ہری سوجھنا (ص ۷۳۴)

ضرب الامثال اور کہاوتیں درحقیقت مدتوں کے علمی و تہذیبی تجربے کا نچوڑ ہوا کرتی ہیں، اِن کا روزمرہ کی عام گفتگو میں استعمال جہاں زبان میں لذت و چٹخارہ پیدا کرتا ہے، وہاں سننے والوں کو بھی لطف

فراہم کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔یہ کہاوتیں نہ صرف اپنے باطن میں تہذیب و معاشرت کے گہرے نقوش لیے ہوئے ہوتی ہیں، بل کہ اپنے اُس زمانے کی معاشرت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہیں، جس زمانے میں اِن کا رواج شروع ہوا۔(۲۳) مثلاً:

''یہ بدنامی اور نیک نامی آپ کیا لے بیٹھیں۔نواب شمس الدین شہید کے ایک ناخنِ پا پر ان جیسوں کو قربان کروں، کوئی آپ کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے تو اس کی ہی پھوٹیں۔انسان کی نیک نامی اس کی انسانیت سے ہوتی ہے۔بڑی آئی ہیں گنوں نہ گوتھوں میں دولہے کی خالہ۔''(۲۴)

چند ضرب الامثال ملاحظہ کیجیے:

''آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر''	(ص۱۴۶)(۲۵)
''کانی کو کون سراہے کانی کا میاں''	(ص۳۲۲)
''باپ پر پوت پتا پر گھوڑا کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا''	(ص۳۴۶)
''ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں''	(ص۶۲۳)
''ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی''	(ص۷۳۳)
''ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی''	(ص۷۵۳)
''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا''	(ص۸۰۷)
''سور ماچنا بھلا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے''	(ص۸۱۱)

اِس ناول کی زبان و بیان کے اوصاف میں کچھ معنوی خوبیاں بھی اِس کے درجہ اعتبار میں اضافہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔مثلاً فاروقی نے اِس ناول میں جا بہ جا ایسے خوب صورت اور بلیغ جملے تحریر کیے ہیں، جنھیں پڑھ کر مصنف کی ذات لاشعوری طور پر ناول کا حصہ معلوم ہونے لگتی ہے۔وہ کرداروں کی گفتگو کے دوران ایسے پر زور جملے لکھ جاتے ہیں، جن کی بہ دولت کرداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ صرف شگفتہ اور پُر جوش ہو جاتی ہے، بل کہ اِن جملوں سے مصنف کے فلسفۂ حیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔علاوہ ازیں ایسے پُر دلیل جملے ناول کی مجموعی حیثیت کو ارتفاع بخشنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر پورا پورا ادبی کیف بھی رکھتے ہیں۔مثلاً:

''ہم نے تو یہی سنا ہے کہ سانپ اور عورت زمین کے اندر ہی ٹھیک ہیں۔''(۲۶)

''دلی کے امیر اب لونڈوں اور طوائفوں پر مرتے ہیں، عزت پر نہیں۔''(۲۷)

''نوابوں کے آنکھ نہیں ہوتی، صرف کان ہوتے ہیں۔''(۲۸)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اِس ناول میں جا بجا عربی الفاظ وتراکیب، احادیث اور قرآنی آیات کا استعمال بھی کیا ہے، جن کے طفیل کرداروں کی گفتگو میں ایک نوع کی سنجیدہ فکری اور علمیت کا عنصر در آیا ہے، جو مجموعی سطح پر ناول کی تاثیر میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

سلام ھی حتیٰ مطلع الفجر (ص۳۹۷)(۲۹)

انا فتحنا لک فتحاًمبیناً (ص۶۸۱)

الا نتظار اشد من الموت (ص۳۷۸،۳۷۹)

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرَی (ص۴۹۱)

اِس ناول میں کہیں کہیں ہندی الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے:

''میرے بچے کو مجھ سے کوئی شکایت ہو اس سے پہلے میں مرجاؤں تو میں اپنے کو بھاگوان جانوں۔''(۳۰)

''توبہ ہے دیدی، آپ بھی کیسی باتیں کرنے لگیں۔''(۳۱)

شمس الرحمٰن فاروقی جنھیں زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے، اُنھوں نے عمومی طور پر تو زبان کا استعمال صاف ستھرا اور زوردار کیا ہے، مگر پھر بھی کہیں کہیں زبان کی ثقالت تفہیم کا راستہ کاٹنے کے درپے رہتی ہے، بالفاظ دیگر اِس ناول میں کہیں کہیں ''تکلف'' کا التزام بھی برتا گیا ہے۔ گو کہ اِس طرح کے اسلوبِ بیان کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، مگر پھر بھی مصنف سے یہ نقص سرزد ہوا ہے، جو بہ ہر حال شگفتہ ناول کی زبان معلوم نہیں ہوتا۔ یہ مثال دیکھیے:

''۱۸۴۴، شہر رام پور، نواب سید محمد سعید خان کا دور سعادت نشان واقبال آسمان، سج دھج میں بازاروں کی چہل پہل میں رونق بزم وکوچہ وبرزن میں، محافل ذکر ومکاتب فکر میں، حلقہ ہائے درس وتعلم میں انجمن آرائی، شعر گوئی وداستان سرائی میں، رام پور رشک دہلی ولکھنؤ بنا چاہتا تھا۔''(۳۲)

تاہم مجموعی اعتبار سے اِس ناول میں انیسویں صدی کے عام لوگوں کی زبان کے جلو میں امرا ونوابین کی زبان بھی موجود ہے، جو اُس دور کی اجتماعی زندگی کا بہترین تعارف پیش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس ناول میں ہند اسلامی تہذیب کی اجتماعی خوبیاں مجتمع ہوگئی ہیں، بالخصوص اُس دور کے لوگوں کی داخلی وخارجی زندگی، عوام کے رجحانات ومیلانات، طرزِ گفتگو اور زبان وبیان کے رنگ اِس ناول میں کمال ہنرمندی سے پیش کیے گئے ہیں۔ فاروقی نے اِس ناول میں ہند اسلامی تہذیب کی گم کردہ زبان کو از سرنو بازیافت کرنے کی

کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ اِس ناول میں اٹھارہویں اورانیسویں صدی کی زبان کے گونا گوں پہلوؤں کا پرتو نظر آتا ہے۔(۳۳)اورقابلِ غورامر یہ ہے کہ اِس ناول میں زبان کی لغزش سرے سے موجودنہیں۔یوں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اِس ناول کی زبان ایک ایسی بے عیب زبان ہے، جس کے سحر میں قاری کھو کر رہ جاتا ہے۔بہ قول ڈاکٹرظہیر آفاق:

> ''ان کی زبان بے جا تلخی، دردوغم،احساسِ کمتری،غرور،کم عقلی اور شکست خوردہ احساسات جیسے عیبوں سے ہمکنار نہیں ہوتی بلکہ محبت،اطمینان،احترام اورشفقت جیسے عناصر پیش کرتی ہے۔ان کی زبان میں بالکل صحیح اورمروج الفاظ کا خزانہ ملتا ہے۔ان کی تحریریں بدلی ہوئی تخلیقی فضا کی ہم ذوق ہوتی ہیں۔تصدیق اوروضاحت کی محتاج نہیں ہوتیں۔''(۳۴)

بات کوسمیٹتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اِس ناول میں زبان کا استعمال انتہائی سلیقہ مندی اورفہم وفراست کے ساتھ کیا ہے۔راست یہی ہے کہ زبان کے عمدہ پارکھ تو وہ ہیں ہی،مگر کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی سمودینے کی مہارت نے اُنھیں ایک کامیاب ناول نگار بننے میں بڑی معاونت کی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

(۱)سہیل بخاری،ڈاکٹر۔اُردوناول نگاری۔لاہور:مکتبہ جدید،۱۹۶۰ء،ص ۴۸

(۲)مظہر جمیل،سید۔''کئی چاند تھے سرِ آسماں''،مشمولہ سمبل۔راولپنڈی:جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء،ص ۳۱۷، ۳۱۸

(۳) پنیت کمار۔''کئی چاند تھے سرِ آسماں''ادب کا بے مثال،لازوال سرمایہ''،مشمولہ خدا لگتی۔مرتبین:لئیق صلاح، ارشادحیدر،حیدرآباد:الانصار پبلیکیشنز،۲۰۱۲ء،ص ۳۵

(۴) رخسانہ بی بی۔''کئی چاند تھے سرِ آسماں''اور''غلام باغ''میں کارفرما تاریخی تصورات کا تقابلی جائزہ''،مشمولہ خدا لگتی۔ص ۵۸

(۵)احمد محفوظ۔''اُردو کا شاہکار ناول''کئی چاند تھے سرِ آسماں''،مشمولہ نئی کتاب۔دہلی:اپریل تا جون،۲۰۰۷ء،ص ۹۴

(۶)ضمیر حسین دہلوی،سید۔''دلی والے''،مشمولہ دلی کی تہذیب۔مرتب:انتظار مرزا،ڈاکٹر،دہلی:اُردو اکادمی، ۱۹۸۷ء،ص ۴۷

(۷) ارشادحیدر،سید۔''کئی چاند تھے سرِ آسماں۔ایک مطالعہ''،مشمولہ خدا لگتی۔ص ۴۳

(۸)منصوراحمد قریشی،ڈاکٹر۔''کئی چاند تھے سرِ آسماں''کا تاریخی اورتہذیبی پس منظر''،مشمولہ راوی۔لاہور:۲۰۰۸ء،ص ۴۲

(۹)شمس الرحمٰن فاروقی۔کئی چاند تھے سرِ آسماں۔کراچی:شہرزاد،۲۰۱۱ء،ص ۳۷۱

(۱۰) ایضاً۔ص ۶۳۸ (۱۱) ایضاً۔ص ۴۸۸

(۱۲) شگفتہ حسین ۔ ''وزیر بیگم: کردار نگاری کی ایک مثالی جہت''، مشمولہ معیار۔اسلام آباد: جلد نمبر ا، شمارہ نمبر ا، جنوری تا جون، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴۰

(۱۳) شمس الرحمٰن فاروقی ۔کئی چاند تھے سر آسماں ۔ص ۲۲۵

(۱۴) فیروز عالم ۔ ''اُردو ناول کی تاریخ کا سنگ میل''، مشمولہ خدا لگتی ۔ص ۱۸۵

(۱۵) شمس الرحمٰن فاروقی ۔کئی چاند تھے سر آسماں ۔ص ۱۲

(۱۶) ایضاً۔ص ۸۳ (۱۷) ایضاً۔ص ۲۰۹

(۱۸) ایضاً۔ص ۵۱۸ (۱۹) ایضاً۔ص ۱۳۹

(۲۰) سید عبداللہ، ڈاکٹر ۔میرا من سے عبدالحق تک ۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱

(۲۱) شمس الرحمٰن فاروقی ۔کئی چاند تھے سر آسماں ۔ص ۶۲۳

(۲۲) مظہر جمیل، سید ۔ ''کئی چاند تھے سر آسماں''، مشمولہ سمبل ۔ص ۳۱۷

(۲۳) شائستہ سہروردی اکرام اللہ ۔دلی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے ۔کراچی: اوکسفورڈ پریس، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵

(۲۴) شمس الرحمٰن فاروقی ۔کئی چاند تھے سر آسماں ۔ص ۶۰۶

(۲۵) راقم نے طوالت اور تکرار کے نقص سے بچنے کے لیے تمام محولہ ضرب الامثال کے آگے قوسین ( ) میں ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کے صفحہ نمبر درج کر دیے ہیں اور انھیں حوالے و حواشی کی ذیل میں شامل نہیں کیا۔

(۲۶) شمس الرحمٰن فاروقی ۔کئی چاند تھے سر آسماں ۔ص ۱۴۸

(۲۷) ایضاً۔ص ۵۰۱ (۲۸) ایضاً۔ص ۵۴۳

(۲۹) راقم نے طوالت اور تکرار کے نقص سے بچنے کے لیے تمام محولہ عربی اقتباسات کے آگے قوسین ( ) میں ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کے صفحہ نمبر درج کر دیے ہیں اور انھیں حوالے و حواشی کی ذیل میں شامل نہیں کیا۔

(۳۰) شمس الرحمٰن فاروقی ۔کئی چاند تھے سر آسماں ۔ص ۶۲۱

(۳۱) ایضاً۔ص ۱۴۶ (۳۲) ایضاً۔ص ۶۰۳

(۳۳) ذاکر حسین ۔ ''کئی چاند تھے سر آسماں نوبل انعام کا مستحق ناول''، مشمولہ خبر نامہ شب خوں ۔الٰہ آباد: جنوری تا جولائی، ۲۰۰۷ء، ص ۶۱

(۳۴) ظہیر آفاق، ڈاکٹر ۔ ''شمس الرحمٰن فاروقی کا انداز گل افشانی''، مشمولہ روشنائی ۔کراچی: جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۳

✿✿✿